Fikr-o-Nasar (Islamabad) 7:7 (1970)

سرسیّد احمد خان اور جدید تعلیم

محمّد نذیر کاکاخیل

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے قدم جم گئے اور کمپنی نے سیاسی اختیارات حاصل کر لئے تو اس کو جو اس سے پہلے مشنری سکولوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی اور ان سکولوں کے ذریعہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کو پھیلاتی رہی، اپنی تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو کم تنخواہ پر ملازم رکھنے کے لئے ان کو نہ صرف انگریزی بلکہ مشرقی علوم کی تعلیم بھی دینی شروع کی گئی۔ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۰ء میں کلکتہ میں مسلمان امراء کے لڑکوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۷۹۰ء میں بنارس میں ہندوؤں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ اوّل الذکر میں عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی جب کہ مؤخر الذکر میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام تھا۔ مدت تعلیم سات سال تھی۔ مشرقی علوم کا پڑھایا جانا سیاسی مصلحت کی بنا پر تھا۔[1]

۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے پروانۂ تجارت کی تجدید کا وقت آیا تو برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی سے، یہ بات منوائی کہ وہ ہندوستان کی تعلیم پر وہاں کے خرچ سے ایک لاکھ روپے سالانہ خرچ کیا کرے۔ لیکن ۱۸۲۵ء تک کمپنی ملکی فتوحات اور سیاسی معاملات میں ایسی مشغول رہی کہ تعلیم کی طرف پورے انہماک سے توجہ نہ دے سکی۔ البتہ اس دوران تعلیمی معاملات میں مختلف حلقوں میں اختلافات رونما ہو گئے چنانچہ چار مسائل تصفیہ طلب رہے۔[2] اوّل: تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیئے؟ دوم: تعلیم کا بندوبست کون کرے؟۔ سوم: تعلیمی زبان کون سی ہو؟ چہارم: تعلیم کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے؟

۱۸۲۵ء میں لارڈ میکالے نے جدید علوم اور انگریزی زبان کی اشاعت کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کی جسے ولیم بینٹنگ کی کونسل نے منظوری دلوا دی۔ اس پر ملک بھر کے علماء نے احتجاج کیا کہ انگریز حکومت کا اس

---

[1] خالد یار خاں۔ تاریخ تعلیم۔ اُردو مرکز لاہور۔ ۱۹۶۳ء صہ ۲۲۹۔ [2] ایضاً صہ ۲۳۱۔

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

کے سوا کوئی ارادہ نہیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنایا جائے۔ الغرض ۱۸۵۷ء تک ملک میں تین قسم[۳] کے مدرسے قائم تھے، جن میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ انگریزی اور مغربی علوم کے لئے مشنری سکول تھے جن میں مذہبی اور دنیوی اُمور کے ساتھ ساتھ دیسی زبان کے ذریعہ بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسری قسم کے مدرسے انگریز حکومت نے قائم کئے تھے جن میں سیکولر تعلیم کا انتظام تھا۔ ان کے علاوہ تیسری قسم ان مدارس کی تھی جو دیسی طرز کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

سید احمد خان نے اس ذہنی انتشار کے زمانے میں آنکھیں کھولیں اور دیسی طرزِ تعلیم کے مطابق تربیت پائی۔ قوم کی پس ماندگی کا درد لئے بظاہر تو جوانی میں اُنھوں نے انگریز کی نوکری اختیار کی لیکن دِل ہی دل میں قوم کی حالتِ زار پر آنسو بہاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ان کے دل پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ قوم کی حالت سدھارنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے صحیح تعلیم و تربیت۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے۔ ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔"[۴]

تعلیم و تربیت پر اظہار رائے کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو کچھ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کی تربیت کرنا ہے ...... تربیت پانے سے تعلیم پانا ضروری نہیں ہے۔ تربیت جتنی چاہو کرو اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو مگر اس سے دل کی مرجی سوتیں نہیں کھلتیں بلکہ بالکل بند

---

[۳] ایضاً ص ۴۲-۲۴۔ [۴] محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مقالاتِ سرسید حصہ ہشتم، ص ۱۳-۱۴۔

ہو جاتی ہیں اندرونی قویٰ کو حرکت دیئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔"

ان خیالات کی روشنی میں جب وہ ہندوستانی مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی" تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں، بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار، جبہ اور کرتہ سے بہت کچھ، مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں .... ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو چکے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے آپ کو بے مثل و بے نظیر قابلِ ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی بلکہ وہ کتابی علم خود بخود ان پر بوجھ ہو جاتا ہے۔"[۵]

سرسید ایک طرف اگر روایتی طرزِ تعلیم کے خلاف نبرد آزما ہیں تو دوسری طرف وہ انگریزوں کے مروجہ نصابِ تعلیم کے بھی برابر ناقد ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ" جو تعلیم کہ حسبِ احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہے۔" سرسید اگرچہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کے دلدادہ تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ قدیم تعلیم کے سرے سے مخالف تھے۔ قدیم تعلیم کی مخالفت صرف اس وجہ سے کر رہے تھے کہ قدیم قدیم نہ رہا تھا بلکہ اس میں زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بہت سی ایسی خامیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ قدیم اور جدید کا فرق بتاتے ہوئے اور قدیم تعلیم کی خوبیاں جتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"اس زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے اور اگلے زمانہ کی تعلیم جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی، یہ فرق ہے کہ اگلے زمانے میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا کہ ہر شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہے تو ہو سکتا تھا اور سوسائٹی جو اس زمانہ میں موجود تھی اس تعلیم کی مدد کرتی تھی اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اس کو

۵۔ ایضاً ص ۱۶-۱۵۔

اس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق وحسنِ معاشرت کے ایسی عمدہ تھی کہ اس میں نقص اس زمانہ میں بھی نہیں نکالا جا سکتا مگر افسوس کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی۔ اِس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعے سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن کا ماہر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں وہ بلاشبہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہیں مگر اس تعلیم کو اعلیٰ کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے"[۶]

سید احمد خان سے قوم کی پس ماندگی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ ان کی ترقی کے خواہاں تھے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ان کو قوم کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ وہ مغربی زبانوں اور علوم مغربی کی تحصیل کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لے" ہمارے ملک کو ہماری قوم کو اگر درحقیقت ترقی کرنی دہے) .... تو اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں کہ وہ علوم مغربی وزبانِ مغربی میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرے۔ ہماری دولت، ہماری حشمت، ہماری عزت، ہماری سوشل، ہماری پولیٹیکل حالت سب کا دارومدار اسی بات پر ہے"[۷]۔ انہوں نے گورنمنٹ کو مشورہ دیا کہ اگر واقعی ہندوستانیوں کی بھلائی مقصود ہے تو اسے چاہیئے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلائے۔

مئی ۱۸۶۲ء میں سید احمد خان کا تبادلہ مراد آباد سے غازی پور ہو گیا تو وہاں ان کو پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہیں پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بے کار اور فضول ہیں۔ علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر ۱۸۶۳ء میں غازی پور سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔[۸]

---

[۶] ایضاً ص ۷ - ۶ - [۷] ایضاً ص ۴۸ -

[۸] مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (لاہور ۱۹۵۷ء طبع جدید) ص ۷۶ - ۱۷۵ - ہمارے سامنے حیاتِ جاوید کا یہی ایڈیشن ہے لہذا تمام حوالوں کے لئے اسی اشاعت سے رجوع کیا جائے۔

۱۸۶۴ء میں جب ان کی تبدیلی علی گڑھ ہوگئی تو وہ اپنے ساتھ سائنٹیفک سوسائٹی کا دفتر بھی وہیں لے گئے۔ ۱۸۶۶ء میں اس سوسائٹی کی طرف سے اخبار" علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نکالا جس میں اکثر مضامین تعلیمی مسائل سے متعلق ہوا کرتے تھے۔

سید احمد خان ہمیشہ سے ہندو مسلم کو ایک قوم شمار کرتے تھے لہٰذا ان کی خدمات دونوں کے لئے یکساں تھیں۔ لیکن ۱۸۶۷ء کے لسانی جھگڑے نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑا[9]۔ اور انہیں یقین ہوگیا کہ ہندو مسلم کا ایک قوم کی حیثیت سے ساتھ ساتھ چلنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں انگریزی پڑھ لکھ کر ہندوؤں سے کسی بھی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ انہوں نے اپنا سارا وقت انگریزی زبان اور مغربی علوم کے حاصل کرنے کی تبلیغ میں صرف کیا۔ ایک طرف اگر سید احمد خان کو انگریزی زبان اور مغربی علوم میں فائدہ نظر آیا اور اُنہوں نے اس فائدے کو اپنی قوم (مسلمان) کے ذہن نشین کرانے کی جدوجہد کی تو دوسری طرف راسخ الاعتقاد علماء کو جدید علوم میں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں۔ اُنھوں نے سر سیّد پر بھی الزام تراشی شروع کی۔ جس کے جواب میں سر سید احمد خان نے علی الاعلان کہہ دیا:" ہمارا مقصد ان تحریروں سے اپنی قوم کو اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ جو مقدس اشخاص علومِ مفیدہ کے حاصل کرنے سے قوم کو باز رکھتے ہیں اور مذہبی تعصب کو کام میں لاتے ہیں اور مذہبی ٹٹی کی آڑ میں لوگوں کو اغوا کرتے ہیں وہ قوم کے، اسلام کے اور مسلمانوں کے درحقیقت دشمن ہیں۔ بعضے تو صرف اپنی دکانداری اور مشیخیت قائم رکھنے اور صرف اپنا تقویٰ اور تقدس لوگوں میں جتانے کو قوم کو غارت کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ دینداری اور ادعائے تقدس محض جھوٹا ہے اسلام ایک نہایت روشن اور سچا مذہب ہے اس کو علوم اور حقائق اشیاء کے معلوم ہونے سے جہاں تک کہ طاقتِ بشری میں ہے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، البتہ علماء کی دکانداری اور مقدسین کے بناوٹی تقدس اور متوہمین کے توہم باطل کو ضرور نقصان پہنچتا ہے پس قوم کو اپنے حال پر خود غور کرنا چاہیئے کہ درحقیقت ان کو کیا کرنا چاہیئے"[10]

" علوم دین کی کتابوں کی ہمارے ہاں کمی نہیں ہے مگر مشکل یہ ہے کہ علمائے اسلام کو بہت سے مذہبی اُمور کے بیان کرنے میں دیگر علوم سے استمداد لینی پڑی ہے اور وہ دیگر علوم ہمارے ہاں کی موجودہ کتابوں میں

---

[9] حیاتِ جاوید صہ ۱۹۳۔ [10] مقالاتِ سر سید VIII صہ ۱۶۲۔

صرف یونانیوں کی تقلید سے بھرے ہوئے ہیں پورے طور پر زمانہ حال کی ترقی کے مطابق موجود نہیں ہیں اور اس لئے ہم کو مذہب کے لئے بھی کسی یورپ کی زبان کے ذریعہ سے ان علوم کے حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے ہاں کے علماء اس بات کو نہیں مانتے۔ اس لئے کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ ان قدیم علوم نے کہاں تک ترقی پائی ہے اور کس طرح ایک چھوٹا سا بیج پودا اور ایک چھوٹا سا پودا عالی شان درخت ہو گیا ہے۔ نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یورپ کی زبانوں میں جو کتابیں ہیں ان میں کیا لکھا ہے۔ نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ علوم جدیدہ سے یونانیوں کے اور ہمارے اگلے علماء کے علوم پر کیا مشکلیں واقع ہوئی ہیں۔ اور جہاں تک وہ مشکل مسائل اسلام سے متعلق ہیں وہ کیونکر حل ہوئے ہیں۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا تو یورپ کی کسی زبان کو تحصیل کرنا وہ فرض کفایہ سمجھتے "[11]

جیسا کہ اس مقالے کے شروع میں بتایا گیا۔ جب سے ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز ہوا، چار مسائل موضوع بحث رہے۔ (۱) تعلیم کا مقصد کیا ہو؟ (۲) تعلیم کا بندوبست کون کرے؟ (۳) تعلیمی زبان کون سی ہو؟ (۴) تعلیم کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔؟

اس بارے میں سر سید کے خیالات بالکل واضح اور دو ٹوک ہیں۔ تعلیم کا مقصد کلرک پیدا کرنا نہیں بلکہ عمدہ سوسائٹی کی تشکیل کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے۔ جب عمدہ سوسائٹی بنے گی تو لوگوں کے اخلاق خود بخود درست ہو جائیں گے۔ کیوں کہ بقول سر سید" اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے"۔ سر سید کے خیال میں اس وقت ہندوستان کی سوسائٹی مہذب نہیں تھی کیونکہ "جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک، خدا پرست، رحم دل، نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہو گئی اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو اب تک قائم نہیں ہوئی یا مکمل نہیں ہوئی"۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک خود اسی قوم کے چند لوگ اس قوم کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور دل سے کوشش نہ کریں سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اور یہی سبب ہے کہ باوجودیکہ کئی قرن گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے گزرے مگر ان کی سوسائٹی کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی۔[12]

"مسلمانوں کی تعلیم کے لئے یہ کافی نہیں کہ دو چار ملاں کسی جگہ پڑھانے کو مقرر کر دیئے جائیں اور وہ وہی

---

[11] ایضاً ص ۱۳۱-۱۳۰
[12] مقالات VIII ص ۸

پرانی کرم کھائی کتابیں دو چار دس پانچ آدمیوں کو پڑھانے لگیں۔ بلکہ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اوّل فہمیدہ فہمیدہ اور ذی عقل لوگ جمع ہوں اور بعد بحث و گفت گو کے یہ بات قرار دیں کہ اب سلسلہ تعلیم بنظر حاجات زمانہ اور بلحاظ علوم و فنون جدیدہ کے کس طرح پر قائم ہونا چاہیئے اور ہماری پرانی دقیانوسی تعلیم کے سلسلے میں کیا کیا تبدیلی اور ترمیم کرنی چاہیئے ہمارا سلسلہ تعلیم بلحاظ مقاصد مذہبی کس طرح پر قائم ہو اور بلحاظ دنیوی کس طرح جاری کیا جاوے۔ اور جب کوئی طریقہ تجویز ہو لے اس وقت اس کے اجراء پر ہر ضلع کے لوگ اپنے اپنے ضلع میں سعی و کوشش کریں۔[۱۳]

سرسید احمد خان کو اس بات کا احساس تھا کہ دینی تعلیم کا انتظام کرنا انگریزی حکومت کے بس کا کام نہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں مختلف مذاہب ہیں ان سب کی تعلیم کا الگ الگ انتظام یا پھر کسی ایک مذہبی گروپ کی تعلیم کا انتظام کر کے دوسروں پر بھی اس نظام کو تھوپ دینا گورنمنٹ کو زیب نہیں دیتا۔ اپنی اس دلیل کی موافقت میں وہ اسلامی سلطنت کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شائد دو ایک مدرسے ایسے ہوں گے جن کا خرچ حکومتِ وقت نے کیا ہو ورنہ تمام مدرسے صرف رعایا کی مدد سے قائم تھے جو ان کے مدرسوں یا بانیوں کو بطور نذر و نیاز ان کے قائم رکھنے کو روپیہ دیتی تھی۔[۱۴]

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لئے سرسید احمد خان مادری زبان کو ترجیح دیتے تھے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ طالب علم کو اس سے بڑی آسانی ہوتی ہے اور جو علم اس زبان کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے اس کا اثر عمل میں بہت قوی اور مفید ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں ایک [illegible] اس کے ذریعہ سے علم خوب شائع ہوتا ہے۔ اس کے برعکس علم کی تحصیل اگر غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے کی جائے تو اس میں دو چند وقت صرف ہوتا ہے۔ اوّل تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر کھو جاتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعے سے جس کو انہوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کی تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہے۔[۱۵] جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے تو اس کے لئے انگریزی زبان ہی موزون ترین ہے اس سلسلے میں سرسید کا استدلال یہ تھا کہ "جس زمانے میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں جو زبان حکومت اختیار کرتی ہے اسی زبان

---

۱۳ مقالات ۸ ص ۷-۱۰۶۔ ۱۴ ایضاً ص ۶-۱۰۳۔ ۱۵ ایضاً ص ۶۱-۶۰۔

کا عروج ہوتا ہے۔ خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کے زمانے میں عربی کا عروج تھا۔ ہر شخص اسی زبان میں علوم کو سیکھتا تھا، ہندوؤں کے زمانہ میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا اسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی عمل داری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں حکومت انگریزی ہے اور اسی زبان کو عروج ہے اس لئے ہر شخص اسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے"[16]

ان کا خیال تھا کہ اعلیٰ تعلیم صرف ترجموں کے ذریعے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ہی اس کے ذریعے ملک کی ترقی کے راستے کھل سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو کیوں میکالے سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوششیں، دہلی کالج کی خدمات اور خود سائنٹیفک سوسائٹی کی قابلِ قدر خدمات بار آور نہ ہو سکیں[17]

"بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شائع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں اور اس کے باعث لوگوں کی رائے اور خیالات سے بہتر تبدیلی پیدا ہونے میں توقف ہوتا ہے اور عام تعلیم مضمحل اور پژمردہ ہو گئی ہے"[18]

سر سید احمد خان نے نہ صرف انگریزی زبان اور مغربی علوم کے رائج کرنے اور ان کو ترقی دینے کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں بلکہ دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے بھی برابر کوشاں رہے۔ لیکن ان زبانوں کے احیاء کا مطلب، جیسا کہ ان کے ایک مقالے سے ظاہر ہے، یہ نہیں تھا کہ مشرقی علوم کو پھر سے زندہ کیا جائے بلکہ وہ صرف اس بات کے خواستگار تھے کہ جو علوم وفنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں انہیں کو شائع کیا جائے۔[19]

وہ ہندوستان میں مروج جدید تعلیم پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس سے بھی آگے کی سوچتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں؛

ہمارے لئے اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم اپنی تعلیم کا مدار صرف کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانوں پر اور بی۔ اے اور ایم اے کی ڈگری پانے پر محدود رکھیں بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو اپنی تعلیم کے لئے صرف ایک دروازہ سمجھیں اور بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا ان ربی

---

[16] مقالات ۸ صـ ۵-۴۔ [17] ایضاً صـ ۲۴۔ [18] ایضاً صـ ۵۷۔ [19] مقالات ۸ صـ ۶۱۔

لغفور الرحیم کہہ کر جہاز پر سوار ہوں اور اپنی کامل تعلیم کے لئے کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں کو اپنی درس گاہ قرار دیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب یونیورسٹی مردہ مشرقی علوم اور مشرقی زبان کو زندہ کر کے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی سکھلا کر ہم کو کیا بخشے گی اور ہم کو کس رتبہ پر پہنچائے گی۔ اس سے بجز اس کے کہ ہم ایک جال میں پھنس جائیں اور ایک ایسے بھنور میں جا پڑیں کہ تمام عمر چکر کھایا کریں اور وہیں کے وہیں رہیں اور نجات کی کچھ توقع نہ ہو اور ہر دم ڈوب جانے کا اندیشہ ہو اور کیا حاصل ہوگا۔[20]

اگست ۱۸۶۷ء میں انہوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغربی کی جانب سے حکومت کو ایک عرضداشت بھیج دی جس میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے لئے ایک ایک سررشتہ قائم کرنے اور ان میں بڑے بڑے علوم کی تعلیم دیسی زبان میں دینے پر زور دیا۔ انگریزی حکومت نے شاید اس کا غلط مطلب لیا۔ کیوں کہ حالی کے قول کے مطابق گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور ثانوی زبان تعلیم کے رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ سرسید نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ ان کی رائے ہرگز یہ نہیں کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے۔ اور اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ ان کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور سررشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعے سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں[21]

حالی مرحوم کے خیال میں سرسید احمد خان خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کے حامی تھے لیکن انہوں (سرسید) نے یہ خیال غالباً زیادہ تر اس وجہ سے چھوڑ دیا ہوگا کہ اوّل تو گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کے گھٹا دینے کا تھا جس کو سرسید کسی قیمت پر بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوسرے بہت سی ایسی مشکلات ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام میں واقع تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا۔ ان میں ترجمہ کی مشکلات، سرسید کا عزم انگلستان، یونیورسٹی کے لئے مناسب جگہ اور خاص طور پر زبان کا مسئلہ بڑا پیچیدہ بن گیا تھا[22]

سید احمد خان کے نزدیک جیسا کہ اس مقالے میں بیان کیا گیا، تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ انسان نہ

۲۰۔ مقالاتِ سرسید، صہ ۴۹ - ۴۸۔

۲۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید (لاہور ۱۹۵۷ء) صہ ۱۸۷ و بعد۔ ۲۲۔ ایضاً صہ ۹۱ - ۱۹۰۔

صرف ایک اچھی سوسائٹی کا معزز ممبر بنے بلکہ اس علم کے ذریعہ دنیاوی جاہ وجلال بھی حاصل کرے۔ جب سے انھوں نے لسانی جھگڑے کی بنا پر متحدہ قومیت کا تصور ترک کر دیا تھا انھوں نے اپنا سارا وقت مسلمانوں کی تعلیمی حالت درست کرنے پر صرف کیا۔

سید احمد خان نے ان لوگوں سے اختلاف کیا جو جدید تعلیم دیئے بغیر ہندوستان کی سماجی اور سیاسی حالت کو درست کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ ان کا یہ خیال مصر کے مصلح اعظم شیخ محمد عبدہ کی طرح بالکل بجا تھا کہ جب تک مسلمانوں میں جدید تعلیم وسیع پیمانے پر نہیں پھیلائی جائے گی اور ان کو علم کے ذریعہ اپنے حقوق سے آگاہ نہیں کیا جائے گا، آزادی بے معنی چیز ہو گی۔ سر سید نے ملک میں رائج سرکاری اور غیر سرکاری مدارس کے نظام ہائے تعلیم سے اختلاف کرتے ہوئے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا۔ اسی طرح انھوں نے جو تجاویز پیش کیں ان میں انگریزی اور دیسی مدرسوں کے نصاب کی خوبیاں جمع کی گئیں اور ان کے نقائص کو دور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ عصر جدید کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کی تعلیم دو طرح کی ہو۔ ایک عام اور دوسری خاص۔ ۲۳؎

عام تعلیم

اوّل۔ دینیات: جس میں فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصولِ حدیث، تفسیر، علم [illegible] علم عقائد شامل ہو۔

دوم۔ علم ادب: زبان دانی اور انشاء پردازی اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، لاطینی، علم تاریخ، جغرافیہ، علم اخلاق، مینٹل سائنس یعنی علم قوائے انسانی، علم منطق، علم فلسفہ، علم سیاست مدنی یعنی اصولِ حکومت، علم انتظام مدن (پولیٹیکل اکونومی)

سوم۔ علم ریاضی: علم حساب، علم جبر ومقابلہ، علم ہندسہ فروعات اعلیٰ علم ریاضی کی۔

چہارم۔ طبیعیات: علم سکون، علم حرکت، علم آب، علم ہوا، علم مناظر، علم برق، علم ہیئت، علم آواز، علم حرارت، نیچر فلاسفی۔

<u>تعلیم خاص</u> مسلمانوں کی ان علوم میں ہونی لازم ہے: انجنیری، علم حیوانات، علم تشریح، زوالوجی (ZOOLOGY) باٹنی یعنی علم نباتات، جیالوجی یعنی علم طبقات الارض، منرالوجی یعنی علم جمادات،

۲۳؎ مقالات ص ۸۰ - ۷۹ -

کیمسٹری یعنی علم کیمیا ۔

سرسید کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلمان بچوں خصوصاً امراء کے لڑکوں کو جب تک ایک خاص مدت کے لئے گھریلو ماحول سے نکال کر ایک الگ جگہ میں نہیں رکھا جائے گا اور ان کو خاص قسم کی تربیت نہ دی جائے، ان کی تعلیم و تربیت بار آور ثابت نہیں ہو گی ۔ چنانچہ ایک مقالے میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"امراء اور اہل مقدور اور ذی دولت مسلمانوں کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ان کی عمر دس برس تک نہ پہنچنے پاوے کہ وہ اپنے گھر سے جدا رکھے جاویں اور ان کی خاص طور پر اور خاص نگرانی میں تعلیم ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ کسی شہر کے قریب جس کی آب و ہوا عمدہ ہو اور شہر بھی چھوٹا ہو ایک پُر فضا میدان تجویز کر کے مکانات تعمیر کئے جاویں اور پھول باغ لگایا جاوے .... کسی لڑکے کے ساتھ خدمت گار نہ رہے ، ...... (یہ تمام لڑکے) ہر روز کی نمازیں جماعت سے پڑھیں اور صبح کی نماز کے بعد کسی قدر قرآن مجید بموجب اس قاعدہ کے پڑھ لیا کریں جو تجویز کیا جاوے ، اور ہر ایک جگہ وقت معین پر کھانا کھاویں .... (اس عمارت کے ساتھ ایک مدرستہ العلوم ہو جس میں) وہ لڑکے امراء اور ذی مقدور لوگوں کے جو ان مکانات میں رہتے ہیں اور نیز مسلمانوں کے جو ان میں نہیں رہتے عموماً تعلیم پاویں گے ۔ یہ مدرسہ در حقیقت تین مدرسوں پر مشتمل ہو گا انگریزی ، اُردو اور عربی فارسی ۔ انگریزی مدرسہ میں انگریزی پڑھائی جائے گی اور تمام علوم و فنون .... انگریزی میں ہوں گے ۔ ہر طالب علم کو اُردو و لاطینی ، لاطینی و فارسی یا لاطینی و عربی بطور سیکنڈ لینگوج کے پڑھنی ہو گی ۔ اور اس کو شمول اپنی تعلیم کے کچھ کتابیں فقہ و حدیث و عقائد کی اُردو زبان میں پڑھ لینی ہو نگی ۔ اُردو مدرسہ میں سارے علوم اُردو زبان میں ہوں گے البتہ طلباء کو انگریزی ، فارسی اور عربی میں سے ایک زبان لازمی ہو گی ۔ عربی فارسی مدرسہ میں کسی علم

کی تعلیم نہیں ہوگی بلکہ انگریزی اور اردو زبان پڑھنے والوں نے ان میں سے جس کو بطور سیکنڈ لینگوج کے اختیار کیا ہو اور اردو میں علوم و فنون پڑھ لینے کے بعد عربی فارسی زبان کے لٹریچر و علوم میں کمال حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ان کی پڑھائی فارسی عربی میں اعلیٰ درجہ تک کی اس مدرسہ میں ہوگی"[۲۴]

تعلیم کو شہر شہر اور دیہات دیہات پھیلانے کے لئے وہ مزید مدرسوں اور مکتبوں کی تجویز پیش کرتے ہیں جن میں ان خطوط پر تعلیم دی جائے گی جو اردو مدرسہ میں ہوگی جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی۔ انگریزی مدرسہ میں جو تعلیم ہوگی اس کا نصاب وہی ہوگا جو کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کا ہوگا۔[۲۵]

سید احمد خان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کے حق میں نہیں تھے[۲۶]۔ کیونکہ ان کے خیال میں سردست ہندوستانیوں کو اس کی ضرورت نہیں بلکہ جو چیز ان پر مقدم ہے وہ ہے اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم، اخلاقی اور سوشل حالت کی درستی۔ ہندوستان میں جو کام لوگ ہاتھوں سے کرتے ہیں وہی چیزیں یورپ میں کلوں سے ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں افرادی قوت کی کمی ہے جب کہ یہاں فراوانی ہے۔ پھر یہ کہ یورپ میں ہر قسم کے کارخانے ہیں، جہاں ٹیکنیکل ایجوکیشن کے فارغ التحصیل جاکر کام کرسکتے ہیں جب کہ ہندوستان میں اس قسم کا فارغ التحصیل طالب علم کارخانے نہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گھر پر بیٹھا رہے گا۔

سر سید احمد خان کے سوانح نگار مولانا حالی سر سید کے ان خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ان بیانات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سردست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی ضرورت ہے جو اب تک بالکل پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیچوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے ہی سر سید کو یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ گورنمنٹ کا منشاء ہائی ایجوکیشن یا انگریزی تعلیم سے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لئے جب کوئی اسپیچ ان کی نظر سے گزرتی

[illegible] صفحات ۸۰ تا ۱۰۰۔

[illegible] ایضاً [illegible]

وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ نہ کچھ لکھتے۔ اور اسی بنا پر اُنھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک ریزولیوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا۔ [۲۷]

سید احمد خان جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سے عمومی طور پر اور ۱۸۷۶ء سے جب کہ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے، خصوصی طور پر ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت کے لئے دن رات مصروف رہے۔ اس عرصہ میں اُنھوں نے نہ صرف اپنی تحریروں سے بلکہ عملی اقدامات سے مسلم قوم کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ بقول مولانا حالیؔ "جو قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند چلی آتی ہو جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل جل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی ہو، اس قوم میں ایک نئی قسم کی تعلیم کا جاری کرنا، جو مضامین تعلیم اور ذریعہ تعلیم دونوں کے لحاظ سے بالکل اُوپری اور غیر مانوس ہو بعینہٖ ایسا ہے جیسے کسی قوم میں، جو اپنے مذہب کی سخت پابند ہو، ایک نئے مذہب کو جاری کرنا" [۲۸] اور اسی وجہ سے سر سید احمد خان کا نام ان زعمائے اصلاح کے اسماء میں نمایاں ہے جنہوں نے قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا رستہ دکھایا۔

بقول خالدہ ادیب خانم "سر سید احمد خان کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اُٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سر سید پسند کرتے۔" [۲۹]

سر سید احمد خان نے جدید تعلیم کا جو رستہ دکھایا، ان کے رفقاء نے قوم کو اس رستے پر چلنے کی ترغیب دی اور یہ چھوٹا سا قافلہ آگے بڑھ کر دوسرے ہم سفروں سے جا ملا، جنہوں نے مشترکہ جدوجہد سے اپنی دیرینہ خواہش "آزادی اور سکھ کا سانس" پوری کر کے دکھائی۔ آج اگرچہ زندگی کی گاڑی بہت آگے جا چکی ہے مگر ہمیں اپنے زعماء کے افکار سے سبق لے کر اور جدید فکر سے اس کو ہم آہنگ کر کے وقتی ضروریات کے مطابق اس کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ حکومت اگرچہ پورے ملک کے تعلیمی اداروں کے چلانے کا بار نہیں اُٹھا سکتی لیکن یکساں نصابِ تعلیم ضرور نافذ کر سکتی ہے اور اس پر عمل درآمد کرا سکتی ہے۔

موجودہ حالات میں جب کہ ملک کی مختلف درس گاہوں میں مختلف ذہنیت کے عالم پیدا کئے جا رہے ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھتے تک نہیں، تو کیسی ہم آہنگی اور کیسا اتحاد۔ جب تک ہم تعلیمی مسائل

---

[۲۷] حیاتِ جاوید ص ۴۷۵۔ [۲۸] حیاتِ جاوید ص ۴۶۸۔ [۲۹] حیاتِ جاوید ص ۷۵۔

پر اپنی پوری قوت صرف نہیں کریں گے دوسرے سارے مسائل ہمیشہ تصفیہ طلب رہیں گے۔

ہم سرسید احمد خان کے اس قول پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں :-

" میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کی جو نیلا نیلا سیاہ رُو ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا، مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوب صورتی حاصل ہوئی ہے۔

اے صاحبو !

کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی آنکھ میں باعزت بنا سکتے ہو ؟ "